

ما بعد صنعتی معاشرہ اور اسلام

پروفیسر عبدالمنفی

۱۷۶۱ء کے قریب انگلستان میں صنعتی انقلاب کا آغاز ہوا اور صرف چالیس سال کے اندر اس نے معاشرے کو اس حد تک بدل دیا کہ اٹھارویں صدی کے آخر میں ہی حساس لوگوں کو محسوس ہونے لگا جیسے عالم انسانیت پر کوئی آفت نازل ہو گئی ہو۔ چنانچہ ۱۷۹۸ء میں ورڈزورٹھ اور کولرج کی نظموں کا جو مجموعہ LYRICAL BALLADS کے نام سے شائع ہوا اس میں یہ احساس بہت نمایاں ہے۔ ورڈزورٹھ کی فطرت پرستی درحقیقت زندگی پر صنعت کے بڑھتے ہوئے غلبے کا ایک رد عمل تھا۔ اس شاعر نے ایک ”موسم بہار کی ابتدا میں لکھے ہوئے اشعار“ کے ذریعے یہ تاریخی سوال اٹھایا:

WHAT MAN HAS MADE OF MAN ?

یعنی انسان نے انسان کی کیا لگت بنائی ہے؟ مطلب یہ کہ آلات اور برق و بخارات نے مل کر اقتصادی و معاشرتی نیز جغرافیائی حالات میں جو زبردست تبدیلیاں کیں وہ انسان کا اپنا ہی کارنامہ ہے۔ ان تبدیلیوں کا نتیجہ نکلا کہ آدمی کی معصومیت اور سادگی ختم ہو گئی اور تمدن کی بڑھتی ہوئی پیچیدگیوں نے تہذیبی قدروں کو پامال کرنا شروع کیا۔

انگلستان کا صنعتی انقلاب سو سال تک روئے زمین کا نقشہ اور سماج کا منہج بدلتا رہا۔ میشت کی ترقیات نے سماج کے اندر نئی انجینیں پیدا کیں۔ انسان فقط ایک مشین کا پیرزہ بن کر رہ گیا۔ ۱۸۵۰ء میں وفات پانے والے انگریزی ناول نگار، چارلس ڈکنز نے اپنے ناول OLIVER TWIST میں دکھایا کہ سماج کے اندر انسان کا استحصال اس حد تک بڑھ گیا ہے کہ کم سن بچے بھی مشینوں کا ایندھن بنانے جانے لگے ہیں اور جرائم کی رفتار روز افزوں ہے، لہذا دنیا HARD TIMES سے گزر رہی ہے، جو اس کے دوسرے ناول کا نام ہے۔

صنعتی انقلاب کی تکمیل نے انیسویں صدی میں انگلستان اور یورپ کے معاشرے میں مکمل انقلاب برپا کر دیا۔ تحریک اصلاح نے سولہویں صدی عیسوی ہی میں سماج پر مذہب کی گرفت ڈھیلی کر دی تھی، بلکہ اجتماعی معاملات سے مذہب کو بے دخل کر دیا تھا۔ چرچ اور اسٹیٹ کی کش مکش میں ریاست جیت گئی اور گرجا کو عبادت تک محدود کر دیا گیا۔ زندگی خدا اور بادشاہ کے درمیان تقسیم ہو گئی، خدا کا حصہ خدا کو اور بادشاہ کا حصہ بادشاہ کو الگ الگ دے دیا گیا۔ مذہب فقط پرائیوٹ معاملہ بن گیا اور پبلک لائف اس سے بیگانہ ہو گئی، حالانکہ تحریک اصلاح کا مطلب کلیسا کے اندر اصلاح تھا اور اس سے لوگوں کے اخلاق کی درستی مقصود تھی، لیکن اس کا نتیجہ بالوقت مذہبی نظام سے بغاوت کی شکل میں نکلا۔ مذہبی احتجاج (PROTESTANTISM) اور تطہیر (PURITANISM) کی تحریکات کو جس واقعے نے پہلے ریاست، پھر یورپ سماج کو لادینیت (Secularism) کے آغوش میں ڈال دینے کی طرف موڑ دیا وہ سولہویں صدی میں فرانس میں رونق پانے والی مغربی نشاۃ ثانیہ (RENAISSANCE) کی وہ ہمگیر تحریک تھی جو علوم و فنون اور ادبیات کی دنیا میں چودھویں صدی عیسوی سے ہی شروع ہو چکی تھی۔ اس تحریک کا اصل محرک تو عہد وسطیٰ میں جو یورپ کی تاریخ کے مطابق ۱۰۶۶ء سے ۱۴۹۲ء تک پھیلا ہوا ہے، مسلمانوں کے ساتھ عیسائیوں کا وہ قریبی رابطہ ہے جو گیارہویں سے تیرہویں صدی عیسوی تک صلیبی جنگوں کے درمیان ہوا اور مسلم سپانیہ کے ساتھ تعلقات کے علاوہ اس رابطے سے بھی قدیم یونان و روم کے علوم و فنون کی کتابیں بالعموم عربی زبان میں، جو عہد وسطیٰ کی واحد بین الاقوامی زبان تھی، اہل مغرب کے ہاتھ لگیں، مگر مذہبی عناد، سیاسی کش مکش اور جنگی مقابلے کے سبب یورپ کے تنگ نظر علمائے آج تک عربوں اور مسلمانوں کے اس احسان کا اعتراف اور عظیمیے کا اقرار گویا نہیں کیا ہے۔ اس کے بجائے انھوں نے براہ راست قدیم یونان و روم سے اپنا ذہنی و اخلاقی رشتہ جوڑ رکھا ہے۔ چنانچہ ارسطو، خرافات اور یونانی و رومی صنمیت نے مل کر مغربی معاشرے کا وہ اساسی ڈھانچہ بنایا اور ساچھ تیار کیا جو عہد جدید کے آفتاب کی پہلی کرن پڑتے ہی پگھل گیا اور اس کی اصلاح کی کوشش نے ہی اس کے اندر انتشار پیدا کر دیا۔

یسویں صدی ماہ صنفی انقلاب کا دور ہے، جس میں یورپ اور امریکہ نے ہر قسم کے صنفی آلات سے مستح ہو کر قدم رکھا اور ان براعظموں میں سائنس کی خالص مادی ترقیات نے گنوولوجیکل اور نیوکلیر معاشرے کو جنم دیا۔ اس معاشرے کی برق رفتاری نے صدی کی دوسری ہی دہائی میں عصر حاضر کو

۱۸-۱۹ء میں پہلی اور پانچویں دہائی میں ۲۹ء سے ۳۵ء تک دوسری جنگ عظیم کا مژدہ منایا گیا جب کہ صدی کے دوسرے نصف کا ہر سال گزرے ہوئے سال سے آگے بڑھ کر تیسری جنگ عظیم کے خطرے سے دنیا کو قریب تر لانا نظر آتا ہے۔ ماضی کی عالمی جنگوں کے اثرات ہولناک ہونے کے باوجود محدود رہے۔ لیکن مستقبل کی جنگ کی متوقع طاقت فیڈرلین کے تصور ہی سے آج کی انسانیت لرزہ برانداز ہے اس لیے کہ وہ بحر و بر کی وسعتوں سے نکل کر فضاؤں پر محیط ہوں گی اور زمین کا کوئی خط ان کی تباہ کاری سے محفوظ نہیں رہے گا۔ اس پیش منظر سے دنیا کے بڑے بڑے دانش ور اور سیاست داں دہشت زدہ ہیں۔ امن وقت کا سب سے بڑا مسئلہ بن گیا ہے اور بدامنی سب سے بڑا واقعہ پھیلی دو جنگیں جنگوں کو فنا کرنے اور امن کو دوام بخشنے کے دعووں اور نعروں کے ساتھ برپا کی گئی تھیں۔ اسی مقصد کے لیے پیپل لیگ آف نیشنز اس کے بعد یونائیٹڈ نیشنز کا قیام عمل میں آیا۔ مجلس اقوام دم توڑ چکی، اقوام متحدہ آخری سانس لے رہی ہے۔ بیسویں صدی کے ختم ہونے میں تقریباً بارہ سال باقی رہ گئے ہیں۔ سوال ہے کیا انسان بھی اس صدی کے ساتھ ہی ختم ہو جائے گا؟

یہ سوال جدید انسان کے سر پر تلوار کی طرح لٹک رہا ہے۔ وہ محسوس کرتا ہے کہ بزرگ زندگی کے لفظوں میں آج کا انتہائی ترقی یافتہ معاشرہ ایک ایسے ہم پر ہیٹھا ہوا ہے جو کسی وقت پھٹ جائے گا اور اس کے پھٹنے ہی معاشرے کے پرچھے اڑ جائیں گے، تہذیب و تمدن ملیا میٹ ہو جائیں گے اور اگر انسانی زندگی باقی رہی تو ایک نئے دور و وحشت سے دوچار ہوگی انسانیت کا قافلہ صدیوں پیچھے چلا جائے گا۔ اس بھیانک انجام سے بچنے کے لیے جنگوں کے اس وقفے میں جسے دورِ امن سمجھا جا رہا ہے آئے دن بین الاقوامی مذاکرات ہوتے رہتے ہیں تخفیف اسلحہ کی بات ہوتی ہے، نا جنگ معاہدوں کی طرف اشارے کیے جاتے ہیں، مختلف ممالک خطہ امن کی تشکیل پر زور دیتے ہیں۔ بڑی طاقتوں کے حلقے، اہل مغرب کی تنظیمیں اور اہل شرق کے ادارے سب اپنی اپنی جگہ گفت و شنید میں لگے ہوئے ہیں۔ لیکن مختلف کشمیتوں سے امن کی جو فاختائیں اڑائی جاتی ہیں وہ لوٹ کر اپنی اپنی کشمیت پر چلی آتی ہیں اور کسی کی چوخی میں شاخ زیتون دکھائی نہیں پڑتی۔

اس نامرادی کا سبب یہ ہے کہ جو مقتدر اصحاب انسانیت کے چارہ ساز بنے ہوئے ہیں وہ حقائق کا مطالعہ کرنے کے لیے آمادہ نہیں، جنگ کے محرکات کا حقیقت پسندانہ

تجزیہ کرنے سے قاصر ہیں اور امن کی موثر تدبیر کرنے کا حوصلہ نہیں رکھتے، ہر ملک صرف دوسرے کو نصیحت کرتا ہے، ہر قوم محض اپنے مفاد کی فکر کرتی ہے، ہر طاقت فقط اپنے حلقہ اثر کا تحفظ کرنا چاہتی ہے، اس لیے کہ انسانی اخوت کے عالم گیر اصول کسی کے سامنے نہیں، سب کے سب آفاقی قدروں سے نااہل ہیں اور بلند اخلاق سے آراستہ کوئی بھی نہیں، نہ کسی کا ذہن صاف ہے نہ کسی کا ضمیر روشن۔ مابعد ضمنی معاشرے کی باگ ڈور کم عقل اور بے کردار لوگوں کے ہاتھوں میں ہے۔

زمین سے اٹھ کر اب ستاروں میں لڑائی کی جو باتیں ہو رہی ہیں وہ بے پناہ مادی ترقیات پر مبنی ہیں۔ انسان کی خلائی پرواز اس وقت ممکن ہوئی ہے جب اس نے بحر و بر کی سطحوں اور تہوں کو چھان مارا ہے۔ فطرت کی بہت سی قوتوں کا راز پکڑا کر آدم خاکی تسخیر عناصر کے خواب دیکھنے لگا ہے، مادہ حیات کی تخلیق و تشکیل کی آرزو کرنے لگا ہے۔ مادی طاقت کی اس فراوانی نے آدمی کے دماغ پر اثر ڈالا ہے۔ مغربی دانش وروں کی ایک معتدبہ تعداد انسان سے برتر کسی وجود کی قائل نہیں، لہذا مذہب اس کے خیال میں ایک فرسودہ تخیل ہے اور اخلاق ایک بوسیدہ تصور۔

حکمتِ زمانہ کے اس انداز نے دنیا کی معیشت کو زندگی کا واحد نصب العین بنا دیا ہے اور معاشرت کا مقصد صرف لطف و لذت ہو کر رہ گیا ہے۔ چنانچہ کسی اعلیٰ سطح نظر کو چھوڑ کر صرف طرز رہائش کی بہتری کو تمام کوششوں کا نشانہ بنا لیا گیا ہے۔ تعلیم و تحقیق، علوم و فنون، سیاست و صنعت، حتیٰ کہ دین کے نام پر ایک خاص قسم کے بظاہر راہبانہ تصوف کا مقصد زیادہ سے زیادہ عیاشی کے سامان فراہم کرنے کے سوا کچھ نہیں۔ اسی ایک مقصد کے لیے آج پوری دنیا میں طاقت، غلبہ اور اقتدار کی ساری کشاکش ہو رہی ہے اور مختلف ممالک ایک دوسرے پر بازی لے جانے کے لیے مہلک ترین

بھتیا رہنا نے یا خریدنے پر اپنی قومی آمدنی کا بیش تر حصہ بے دریغ خرچ کر رہے ہیں، پھر لطیف اور المیہ یہ ہے کہ وہی ممالک امن کی رٹ بھی نکا رہے ہیں، دوسروں کو جنگ باز اور اپنے آپ کو بہت امن پسند بتا رہے ہیں یہ ممالک مغرب میں بھی ہیں اور مشرق میں بھی، یورپ ہو یا امریکہ ایشیا ہو یا افریقہ، جو ملک آبادی، رقبہ اور وسائل کے اعتبار سے جتنا بڑا ہے وہ اتنی ہی زیادہ نگاری و فریب کاری اور خود پسندی و خود غرضی سے کام لے رہا ہے۔ اس تناظر میں بڑی طاقتوں اور چھوٹی قوتوں کو جو چیز ایک دوسرے کے ساتھ دست و گریباں ہونے سے روکتی رہی ہے وہ برٹنڈ رسل کے الفاظ میں محض دہشت کا توازن (BALANCE OF TERROR) ہے، ہر قوم کا سربراہ فقط اس خوف سے اپنا جنگ کی طرف بڑھتا ہوا ہاتھ روک لیتا ہے کہ اگر

اس نے دوسرے پر فوج کشی کا اقدام کیا تو جواب میں اس کی قوم کی تباہی کا سامان بھی اسی طرح ہو جائے گا جس طرح دوسری قوم کی بربادی کا۔

یہ ہے آج کا بابعد صنعتی معاشرہ (POST INDUSTRIAL SOCIETY) جس سے عصر حاضر میں اسلام کو سابقہ درپیش ہے۔ جدید ترقی یافتہ معاشرہ درحقیقت مذہبیت اور تمام مذاہب کے لیے ایک چیلنج بن کر سامنے آیا ہے، اس لیے کہ اس کے متعدد اقدامات نے الابیات اور اخلاقیات، مذہب کے فکری و علمی دونوں پہلوؤں پر ضرب لگائی ہے۔ چنانچہ ہر مذہب کے مخلص افراد اپنی اپنی جگہ نئے علاج کے مسائل سے پریشان ہیں اور ان کے حل کی تدابیر بھی سوچ رہے ہیں۔ لیکن اسلام کے سوا دیگر مذاہب کی مجبوری یہ ہے کہ ان میں سے کسی کے پاس نہ تو مستند دینی عقاید ہیں نہ ان عقاید پر عمل کرنے والی نمونے کی کوئی انسانی سیرت اور تاریخ۔ چنانچہ یہ مذاہب صرف ادہام و خرافات میں مبتلا اور فقط اساطیر سازی اور کسی نہ کسی نوع کی اصنام پرستی میں محو ہیں۔ شاید انھیں اپنی اس خامی کا خود بھی احساس ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے ماننے والے زندگی کے عام میدانِ عمل سے ہٹ کر گرجاؤں، مندروں، مٹھوں، خانقاہوں اور عبادت خانوں کے گوشوں میں پناہ گیر ہو چکے ہیں، انھوں نے دنیا کے معاملات میں دنیا پرستوں کی بڑی تسلیم کرنی ہے اور اپنے آپ کو صرف ان کی دعا گوئی اور وظیفہ خواری تک محدود کر لیا ہے۔ دنیا پرستوں میں خدا پرستی کا دم بھرنے والے بھی رسمی عبادت گزاری اور وظیفہ خواری سے آگے نہیں بڑھتے، انھوں نے اپنے دھرم اور رجن کو دنیا سے الگ کر لیا اور اپنی دنیا کو دھرم اور رجن سے آزاد کر دیا ہے۔ اسی حقیقت کے پیش نظر بیسویں صدی میں انگریزی کے سب سے بڑے ڈرامہ نگار اور انشا پرداز لڈز بزارڈ شائے اپنے سب سے بڑے ڈرامے (BACK TO METHUSELAN) میں پیش گوئی کی کہ جدید انسان معاشرے کی علمی، صنعتی اور تکنیکی ترقیات کی تاب اسلام کے سوا کوئی دوسرا مذہب نہیں لاسکتا اور ترقی یافتہ انسان کو اگر کوئی مذہبی ضابطہ حیات سمجھال سکتا ہے تو وہ صرف شریعتِ محمدی ہے۔ آزلڈ ٹوین بی نے بھی اپنی کتاب (CIVILISATION ON TRIAL) میں خیال ظاہر کیا ہے کہ اسلامی توحید وہ واحد تصور ہے جو آج کی بکھرتی ہوئی انسانیت کی شیرازہ بندی کر کے وحدتِ الہ اور وحدتِ آدم کی بنیاد پر ایک عالم گیر حریت، اخوت اور مساوات قائم کر سکتا ہے جو بین الاقوامی کش مکش اور آویزش کو بالکل ختم کر دے، یہاں تک کہ ایک ہمہ گیر جنگ و ہلاکت کا خطرہ دنیا کے سر پر سے مٹ جائے۔

یہ تلخی رول اسلام دور جدید میں اسی طرح ادا کر سکتا ہے جس طرح اس نے عہدِ قدیم

میں ادا کیا تھا چودہ سو سال قبل کے قرونِ مظلمہ (DARK AGES) میں ایک قدیم جاہلیت نے عربوں کو خانہ جنگی اور روم و ایران کی بڑی طاقتوں کو بین الاقوامی جنگ کی بھٹی میں جھینک دیا تھا۔ آج کی دنیا میں ایک جدید جاہلیت نے تقریباً ہر قوم کو ایک قسم کی خانہ جنگی میں ڈال دیا اور تمام قوموں کو ایک آخری عالمی جنگ کے دہانے پر کھرا کر دیا ہے، جب کہ قوموں کی باہمی چھٹش مختلف خطوں میں موجودہ صدی کے آغاز ہی سے روز افزوں ہے۔ جن وجوہ سے یہ تنازع پیدا ہوا اور جاری ہے حیاتیات، نفسیات اور معاشیات کے جدید نظریات نے انھیں لازماً حیاتِ قرار دے کر ایک فطری و دائمی جہدِ لبقا (STRUGGLE FOR EXISTENCE) تسلیم کر لیا ہے۔ ڈارون کا نظریہ بقا نے اصل (SERVIVAL OF THE FITTEST)؛ فزائڈ کا تصور جنس اور مارکس کا فلسفہ اقتصادیات انسان کو حلقوں، صنفوں اور طبقوں میں مستقل طور پر تقسیم کر کے ہر فرد بشر کو دوسرے کا حریف قرار دے دیتا ہے۔ لہذا افراد کے درمیان رفاقت کی کوئی بنیاد ذاتی مفاد پرستی یا گروہی معاملہ بندی کے سوا باقی نہیں رہ جاتی۔ اسلام نے نیابتِ الہی، شرافتِ انسانی، تعددِ ازدواج و طلاق اور دولتِ بحیثیت امانت کے اصلاحی و انقلابی تصورات پیش کر کے امن و اعتماد اور عدل و انصاف کی راہیں ہموار کر دی ہیں۔ ان تصورات میں مادیت و روحانیت کا توازن، دین و دنیا کی موافقت اور نبی آدم کے باہمی اشتراک و تعاون کی قدریں نمایاں ہیں۔ اسلامی عقاید کے مطابق نہ کوئی شخص فوق البشر ہو سکتا ہے، نہ کوئی صنف فقط علامتِ جنس بن سکتی ہے، نہ کوئی طبقہ دوسرے طبقات کا آمرانہ استحصال کر سکتا ہے۔ خیر البشر کا نمونہ ہر فرد جماعت کو بندہ خدا، خادم خلق، ایک دوسرے کا غمگسار اور چارہ ساز بنانے کا سامان کرتا ہے، جس کی جو جائز خواہش، ضرورت اور آرزو ہے وہ دوسرے کسی کی خواہش، ضرورت اور آرزو کا خون کیے بغیر پوری ہو جاتی ہے، اس لیے کہ اس تکمیل میں ہر ایک دوسرے کا بھی خواہ اور معاون ہوتا ہے، بدخواہ اور مڑا جم نہیں، جیسا کہ میکالکی و حیوانی ارتقا، جنسیاتی نفسیات اور اشتراکیت کے تحت ہوتا ہے۔

اسلامی تصورِ توحید انسان اور انسان کے درمیان تمام تفرقوں کو ختم کر کے ایک آفاقی معاشرہ تشکیل دیتا ہے، جس کے افراد آپس میں کسی قسم کے تضاد کے بجائے مطابقت کی نسبت رکھتے ہیں۔ اس تصور کے مطابق انسان کے اندر انسانیت، نہ کہ حیوانیت، اجاگر ہے، مرد و زن ہندین نہیں زوجین ہیں اور ایک دوسرے کے ساتھ متعدد درشتوں میں بندھے ہوئے ہیں، امیر و غریب کے درمیان دولت کا فرق کوئی طبقاتی نزاع نہیں پیدا کرتا، بلکہ معیشت کے کاروبار اور معاشرت

کی سرگرمیوں میں ایک کو دوسرے کا منہمدا اور تہمتا بناتا ہے، اختلاف فطری ہے، جب کہ مخالفت مصنوعی، لہذا مختلف عناصر کو ایک دوسرے کا مخالف بننے کے بجائے معاون بن کر کام کرنا ہے۔ اسی اشتراکِ عمل میں دونوں کے اپنے اپنے مقدر کی تعمیر مضمحل ہے۔ دراصل توحید اگر مذہب کا نقطہ آغاز ہے تو سائنس کا نقطہ عروج چنانچہ تمام سائنسی ترقیات جس منزل کی طرف پیش قدمی کر رہی ہیں وہ کائنات و حیات میں ایک اصول و وحدت کا سراغ ہے۔ موجودہ صدی کی پہلی چوتھائی میں آئن سٹائن کا ریاضیاتی نظریہ اضافیت اسی صداقت کا علم بردار بن آیا اور اس نے انیسویں صدی کی سائنس سے رونما ہونے والی مادہ پرستی پر ایک کاری ضرب لگائی، لیکن یہ نظریہ اضافیت تک پہنچ کر رک گیا۔ اس کے ارتقا کی اگلی منزل لازماً وحدت ہے، جس کی جستجو کا اعلان صدی کی آخری چوتھائی میں نوبل انعام یافتہ سائنس دان جناب عبدالسلام کر رہے ہیں۔ فی الواقع جدید سائنس کے سب سے ترقی یافتہ شعبے، نیوکلیئر فزکس، کا مطلب ہی یہ ہے کہ عالم طبعی میں کوئی مرکز (NUCLEUS) ہے جس کی تلاش مقصود حکمت ہے۔ یہ مرکز عالم ذات باری تعالیٰ کی خلائی ہی کا وہ کرشمہ ہو سکتا ہے جو کائنات کی تمام ترقیات کا منبع اور اساس ہے۔ اس طرح ممکن اور متوقع ہے کہ بالحد صنعتی معاشرہ بالآخر اپنے علم و عقل اور تجربے سے بھی رب العالمین کی وحدانیت کا وہ مکمل دریافت کر لے جو اسلام اور صرف اسلام کا کلمہ ایمان ہے، اس لیے کہ یہودیت، عیسائیت، بودھ مت ہندو دھرم سب کے سب شرک و کفر یا دہریت و الحاد میں مبتلا ہیں۔ اسی لیے انگریزی میں مورخ، ٹوائین بی نے CIVILISATION ON TRIAL میں اقرار کیا ہے کہ آج توحید صرف اسلامی معاشرے میں موجود ہے، جب کہ سچی معاشرہ تثلیث کا شکار ہے۔

اسلام کا عقیدہ رسالت اس کے عقیدہ توحید کے مطابق ہے۔ قرآن مسلمانوں کو اللہ کے تمام رسولوں پر ایمان لانے کی تلقین کرتا ہے، اس لیے کہ حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم اللہ تعالیٰ کے پہلے، اکیلے اور انوکھے رسول نہیں ہیں، اللہ کے رسول پہلے انسان حضرت آدم علیہ السلام کے وقت سے ہر دور اور ہر خطے میں آتے رہے ہیں، وہ سب ایک ہی دین کے مبلغ تھے جس کا نام اسلام ہے اور اسلام کائنات کی تمام مخلوقات، جمادات، حیوانات اور پوری نوع انسانی کا واحد فطری اور حقیقی دین ہے، جس کی شریعتیں صدیوں تک مختلف ادوار و مقامات میں وحی کے ذریعے انبیاء و رسل کو دی جانے والی کتابوں میں نازل ہوتی رہیں، دنیا کے ساتھ ساتھ دین کا ارتقا بھی ہوتا رہا، یہاں تک کہ جب انسان اپنے بلوغ کو پہنچ گیا اور تاریخ کی پوری روشنی میں

آگیا تو خدا کی قدرت و مشیت نے دین اسلام کی تکمیل شریعت محمدی سے کردی اور اپنے آخری رسول کو انسانیت کا نمونہ کامل بنا دیا، اس پر نازل ہونے والی کتاب، قرآن مجید، کو وحی الہی کا آخری اور مکمل اڈیشن قرار دیا، جس میں پچھلے رسولوں پر نازل ہونے والی تمام آفاقی و اصولی تعلیمات جمع کر دی گئی ہیں، زندگی کی ہر ضروری اور بنیادی حقیقت کی تشریح و تفصیل کر دی گئی ہے اور نہ صرف اللہ کے کلام کو بالکل محفوظ کر دیا گیا بلکہ جس ذات پر یہ کلام نازل ہوا اور جس نے اس پر عمل کر کے دکھایا اس کی سنت و سیرت کا بھی ایک ایسا ریکارڈ مرتب کر دیا گیا جس کی صحت کو جانچنے کے لیے ایک مہار مقرر کر دیا گیا۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ کے آخری رسول نے ایک ایسا معاشرہ قائم کیا اور ایک ایسی ریاست تشکیل دی جو انسان کی انفرادی و اجتماعی زندگی کے لیے قیامت تک ایک نمونہ عمل ہے۔ یہ سب سے روشن، سب سے کشادہ اور سیرھا منزل کی طرف جانے اور لے جانے والا واحد جاہدہ حیات ہے، جب کہ اس کے چاروں طرف بے شمار ٹیڑھی میڑھی پگڈنڈیاں اور اندھیری گلیاں انسانیت کے قافلے کو بھٹکانے کے لیے بکھری پڑی ہیں۔

جس طرح اللہ رب العالمین ہے اسی طرح حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم رحمتہ للعالمین ہیں۔ خدا تمام عالم کا پروردگار ہے اور خدا کے آخری رسول تمام عالم کے لیے رحمت ہیں۔ وہ کسی ایک فرقے، علاقے، قبیلے، طبقے اور حلقے کے نہیں، دنیا کے تمام انسانوں کے رسول بلا کسی امتیاز کے ہیں، ان کی شریعت محض مسلمانوں کا پرسنل لا نہیں ہے، پوری انسانیت کا ضابطہ حیات ہے، ان کی سیرت ہر فرد بشر کے لیے اخلاق و کردار کا سب سے اعلیٰ نمونہ ہے۔ جہتم رسالت انسانی فکری آزادی کا پر واز بھی ہے۔

اقبال نے اپنے بصیرت افروز خطبات RECONSTRUCTION OF RELIGIOUS THOUGHT IN

ISLAM (فکر اسلامی کی تشکیل جدید) میں یہ نکتہ پیش کیا ہے کہ رسول کریم علیہ الصلوٰۃ والسلام کی بعثت نے نظام حیات کی اس درجہ تکمیل کر دی کہ اب خدا کی طرف سے نہ دوسرا کوئی رسول نے گا نہ دوسری کوئی وحی نازل ہوگی، لہذا انسانی فکر کی کارگزاروں میں اب براہ راست خدا کی جانب سے کوئی دخل نہیں دیا جائے گا، بلکہ انسان آزاد ہے کہ اپنے تفکر و تدبیر سے کام لے کر ارتقاء کی اگلی منزلوں کی طرف بڑھتا جائے، بس اسے حدود اللہ کے اندر رہ کر خدا و رسول کے واضح احکام و ہدایات سے ہموار کیے ہوئے ضراط مستقیم پر گامزن رہنا ہے، ان حدود کی پابندی کر کے اس شاہراہ پر قدم بڑھاتے ہوئے وہ تخیر کا نانت اور ارتقاء حیات کے لیے جو بھی چاہے کر سکتا اور ترقی کی آخری حد تک پہنچ سکتا ہے، جو اس سے کم کوئی چیز نہیں ہے کہ بندہ خدا کے قریب پہنچ کر رضائے الہی کا حصول کر لے۔

انسانیت کے اس فروغ و عروج ہی پر معراج النبی کا عظیم الشان اور بے مثال واقعہ دلالت کرتا ہے۔ سورہ بنی اسرائیل اور سورہ النجم کی متعلقہ آیات کو ملا کر پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ایک شب رسول کریم علیہ الصلوٰۃ والسلام چند لمحات کے اندر مکہ سے بیت المقدس اور وہاں سے آسمانوں میں، تمام سیاروں اور ستاروں سے گزر کر، سدرۃ المنتہیٰ تک پہنچے اور حیات و کائنات کے عمیق ترین حقائق کا مشاہدہ کر کے روئے زمین پر لوٹ آئے۔ یہ بہترین اور عظیم ترین انسان کے ہاتھوں فتح کائنات کا واقعہ ہے اور اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ایک بندہ خدا (عبدہ) نظام کائنات کی آخری سرحد تک جاسکتا ہے۔ احادیث میں اس واقعہ کی تفصیلات پر غور کرنے سے آشکارا ہوتا ہے کہ خاتم الانبیاء اور ختم الرسل کو معراج کے سفر پر لے جانے سے پہلے آپ کا سینہ مبارک چاک کر کے اس میں نور معرفت بھر دیا گیا اور جس سواری پر آپ نے سیاحتِ علویٰ کی وہ برق سے مشتق ”براق“ نام کی سواری تھی۔ عصر حاضر میں انسان کی خلائی پرواز آواز سے زیادہ تیز رفتار (SUPERSCIE-NCE) راکٹوں کے ذریعے ہو رہی ہے، مگر بندہ تر فضائوں کی سیر، بالخصوص ستاروں کی سیاحت، اسی وقت ممکن ہے جب روشنی اور بجلی کی رفتار سے چلنے والے جہاز ایجاد ہو جائیں۔ معراج کی سواری براق اس ایجاد کے امکان کی طرف ایک اشارہ ہے۔ پھر سوال ہے کہ کیا روحانی قوت کے بغیر جسم انسانی اتنی تیز رفتار کا تحمل ہو سکتا ہے؟ اس سوال کا کوئی جواب نور معرفت کے سوا ممکن نہیں۔ نور رسالت کا پرتو ایک صاحبِ ایمان پر پڑ سکتا ہے اور رسول کے نشانِ راہ پر چل کر ایک بندہ خدا توفیقِ الہی کے مطابق ستاروں سے آگے جاسکتا ہے۔ اس طرح مادی و روحانی طاقتوں کا توازن ہی وہ کلید ہے جو زمین پر بسنے والے انسان کے لیے آسمانوں کے بند دروازے کھول سکتی ہے۔ لیکن اس توازن کے حصول کی شرط رسولِ آخر الزماں کی شریعت کی پابندی اور سیرت کی پیروی ہے۔ اس کے ساتھ قرآن نے آفاق و انفس کی آیات کا تجسس اور تتبع کرنے کی جو ہدایت کی ہے اس پر ایمان کی پوری بصیرت و جرات کے ساتھ عمل کرنا بھی ضروری ہے۔ یہ ایک کارگزار ہے جو جو صلہ مند اور اولوالعزم اہل ایمان ہی بہترین شعور و کردار کے ساتھ انجام دے سکتے اور اسے پایہ تکمیل تک پہنچا سکتے ہیں۔ اس مہم کی مشکلات کا اندازہ کر کے ہی دنیا کے سب سے بڑے شاعر اور ہیروں صدی کے سب سے زیادہ تیز نگاہ فلسفی، اقبال نے، جنھیں دور جدید کے عظیم ترین مفکر علامہ سید ابوالاعلیٰ مودودی رحمۃ اللہ علیہ نے ”اکابرِ مفکرین اسلام“ میں شمار کیا ہے، اپنے آخری مجموعہ کلام ”لرمغانِ حجاز“ کے ایک فارسی قطعے میں ارشاد کیا:

برنور تو برافر دزم نگہ را کہ بنیم اندرون مہر و مہ را
چوں می گویم مسلمانم بلرزم کہ دایم مشکلات لاله را
(اے رسول کریم! آپ کے نور نبوت سے اپنی نگاہ روشن کر کے چاند اور سورج کے
اندر کی دنیا دیکھنا چاہتا ہوں۔ لیکن جب اپنے آپ کو مسلمان کہتا ہوں تو کاتب اٹھتا ہوں اس
لیے کہ میں کلمہ اسلام لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ کی مشکلات سے واقف ہوں)

حقیق کی اس تشریح سے تصور کیا جاسکتا ہے کہ اسلام کا نظریہ ارتقا کیا ہے؟ یہ
یقیناً ڈارون کا وہ مادہ پرستانہ، حیوانی و میکانکی ارتقا، (MATERIALIST, ANIMAL & MEC-
HANICAL EVOLUTION) نہیں ہے جس کے مطابق مادہ ایک خود کار (AUTOMATIC) عمل سے
ترقی کرتا ہوا، ایک عضویاتی تسلسل (ORGANIC CONTINUITY) کے ساتھ، جمادات اور حیوانات کی
مختلف و متنوع اشکال سے برآمد ہو کر انسان کی صورت میں آگیا ہے اور آئندہ جرمین فلسفی نیتسز (NIETZSCH)
کے خیال میں فوق البشر (SUPERMAN) کی پیدائش کا باعث ہوگا۔ اس بے مہار ارتقا میں جرمین فلسفی
ہیگل (HEGEL) کی فکری جدلیات کی جو تعبیر مارکس نے جدلیاتی مادیت یا مادی جدلیات
(DIALECTIC MATERIALISM OR MATERIALISTIC DIALECTICISM) کی صورت میں
پیش کی ہے اور اس کی بنا پر پوری تاریخ انسانی کا ایک خالص اقتصادی تجربہ سرمایہ و محنت کی کش مکش
کی شکل میں کر ڈالا ہے اس کا بھی کوئی تعلق اسلام سے نہیں ہو سکتا۔ قرآن صریحاً ایک تخلیقی ارتقا
(CREATIVE EVOLUTION) کا تصور پیش کر کے حیات و کائنات کی الوہی و اخلاقی ترقی (DIVINE
AND MORAL PROGRESS) کی طرف واضح اشارے کرتا ہے۔ منشاء خداوندی کے مطابق آدم کی
تخلیق اور خدا کے بخشے ہوئے علم کے سبب ملائکہ پر انسان کی فضیلت کے واقعات بجائے خود تشریح
کرتے ہیں کہ اسلامی اصول ارتقا کیا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے کیے بعد دیگرے، الگ الگ جمادات اور حیوانات
کی تخلیق کر کے پہلے ایک دنیا بسالی، تب اس نے رونے زمین پر اپنا خلیفہ بنا کر انسان کو تمام قولی اور اختیارات
کے ساتھ ایک منصوبے کی تکمیل کے لیے بھیجا اور اپنے احکام کی بجا آوری کے لیے اس کے فرائض کی پہچان
ایک پیمانہ ازل کے ذریعہ انسان کے ضمیر میں ودیعت کر دی۔ اس کے علاوہ شیطان کے ساتھ انسان کا
تصادم کر کے حکمت الہی نے واضح کر دیا کہ دنیا ایک رزم کاہنہ خیر و شر ہے اور ارتقا نے حیات کی ساری پیکار
حق و باطل کے درمیان بالکل اخلاقی سطح پر ہوگی۔ اقبال نے ”بانگ درا“ کی ایک نظم ”ارتقا“ میں یہی نکتہ ایک
علامتی انداز سے بیان کیا ہے: ع

ستیزہ کار رہا ہے ازل سے تا امروز جس راع مصطفوی سے شرار بولہبی
خیر و شر اور حق و باطل کی اس آفاقی کشمکش میں خیر کی قوت بن کر شر پر غالب آنا اور زندگی کو
ذہنی و اخلاقی ترقی کی اگلی منزلوں کی طرف بڑھانا دنیا میں ملت اسلامیہ کا وہ مشہور عالم نصب العین ہے
جس کی ترجمانی قرآن حکیم نے امر بالمعروف اور نہی عن المنکر سے کی ہے۔ اس نصب العین کی پیش رفت
ہی وہ کائناتی امانت ہے جس کا بلا زہادوں، زمین اور آسمانوں کے عاجز رہنے کے بعد انسان نے روز ازل
سے ابد تک کے لیے اٹھا رکھا ہے۔ خاتم المرسلین کو اسی انسانی مشن کی تکمیل کے لیے جن عظیم و عظیم مقاصد کے
ساتھ مبعوث کیا گیا وہ قرآن کے مطابق یہ ہیں:

(۱) آیات الہی کی تبلیغ (۲) تزکیہ نفوس (۳) تعلیم کتاب۔ (۴) تعلیم حکمت۔

یہ سب مقاصد باہم مربوط اور ایک دوسرے سے باہل ہم آہنگ ہیں ان میں سے کسی ایک کو بھی چھوڑ کر وہ
اخلاقی ارتقا ممکن نہیں جسے انسان کا مقدر بنایا گیا ہے۔ رسول کریم علیہ الصلوٰۃ و التسلیم نے اپنی رسالت
کے ۲۳ سال میں یہ چاروں کام بہ یک وقت اور یکساں طور پر کیے۔ آپ نے اپنے اوپر نازل ہونے
والے احکام و حقائق کو اجزائے قرآن کی شکل میں بہ تمام و کمال اہل دنیا اور عالم انسانیت تک پہنچا دیا
اس کے ساتھ ہی آپ نے انسانوں کی کردار سازی کی ان کی سیرتوں کو تمام آلوگوں سے پاک و صاف
کر کے انھیں بڑی سے بڑی مہمات سر کرنے اور خدمات انجام دینے کے قابل بنا دیا اس کے علاوہ آپ
نے کتاب اللہ کے احکام و ہدایات کی مسلسل تشریح و تدریس اپنے قول و فعل سے کی سب سے بڑھ
کر حضور نے ایک ایک حکم و ہدایت کی حکمت لوگوں پر واضح کر دی اور انھیں دعوت قرآنی کی روشنی میں حیات
و کائنات کے تمام مظاہر پر پیہم غور و فکر کی تلقین کی تاکہ وہ مشیت الہی کو سمجھ کر، مشائخ و خاندانی کے مطابق
اپنے افعال و اعمال، ایک ایک حرکت اور ہر قسم کی سرگرمی سے رضائے الہی کے حصول کی سعی کریں۔ یہی
و جب ہے کہ قرآن حکیم نے حکمت کو خیر کثیر اور ریسوخ علم کو باعث ایمان نیز معیار تقویٰ قرار دیا۔

یہ ایک مثالی زندگی کا نقشہ ہے جس پر عمل کے لیے ایک مثالی معاشرہ درکار ہے۔ ریاست
مدینہ کے دور رسالت اور اس کے بعد قائم ہونے والی خلافت راشدہ کے دوران تقریباً نصف
صدی کے لیے ایک نمونے کی انفرادی و اجتماعی زندگی کا جلوہ دینا نے انسانیت کو دکھا دیا گیا۔
اب تاریخ کے ہر دور اور جغرافیہ کے ہر خطے میں تمام افراد اور پوری نوب انسانی کا امتحان یہ ہے کہ
وہ کس حد تک اس نمونے پر اپنی زندگی کو ڈھال سکتے ہیں۔ اس امتحان میں کامیابی کے لیے ایک مکمل
معاشرتی ضابطہ (CIVIL CODE) قرآن و سنت کی روشنی میں مرتب ہو کر موجود ہے فقہ اسلامی

(ISLAMIC JURISPRUDENCE) اسی ضابطے کی نشان دہی کرتی ہے، اگرچہ فقہ میں اجتہاد اور اس کے نتیجے میں تجدید حیات اور حل مسائل کا دروازہ کھلا ہوا ہے۔ سماج کے اندر پیدا ہونے والے نئے نئے معاشرتی سوالات کا جواب ماہرین قانونِ اسلامی قرآن و سنت کی وضاحتوں کی روشنی میں شرعی قیاس و اجتہاد سے کام لے کر علمائے دین اور ملتِ اسلامیہ کے اجماع کے ساتھ بخوبی دے سکتے ہیں۔ اس طرح اسلامی معاشرہ حدود اللہ کے اندر ترقی کرتا ہوا ہمیشہ تازہ دم رہ سکتا اور اپنے افراد کو میدان ارتقاء میں پیش قدم رکھ سکتا ہے۔

کیا موجودہ مسلم معاشرہ ماہنامہ صفتی زندگی کے تقاضے پورے کر سکتا ہے اور کیا وہ اسلام کا مثالی معاشرہ ہے؟ یہ سوال ہمارے موضوع سے بہت زیادہ تعلق نہیں رکھتا۔ ہم اسلامی نصب العین کی بات کر رہے ہیں، نہ کہ آج کے مسلمانوں کی اور صاف بات یہ ہے کہ اگر عصر حاضر کے مسلمان مثالی یا معیاری مسلم دعوٰی ہوتے تو وہ سوال ہی نہیں اٹھتا جس پر ہم گفت و گو کر رہے ہیں۔ اس سوال کا مطلب ہی یہ ہے کہ موجودہ مسلم معاشرہ اسلامی نقطہ نظر سے ناقص اور خام ہے۔ لیکن خدا کا دین مسلمانوں کا محتاج نہیں ہے، البتہ مسلمان اپنی آبر و مند زندگی اور ترقی کے لیے خدا کے دین کے محتاج ہیں۔ تقریباً ڈیڑھ ہزار سال کی تاریخ یہ بتاتی ہے کہ مسلمان جب کبھی دنیا میں آگے بڑھے ہیں تو اسلام کو لے کر اور جب پیچھے ہٹے ہیں تو اسلام کو چھوڑ کر حکمتِ خداوندی نے کبھی اسلام سے الگ ہو کر مسلمانوں کو دنیا میں نپینے کا موقع نہیں دیا ہے، حالانکہ یہودی اور عیسائی یا دیگر مذاہب کے ماننے والے صدیوں سے اپنے اپنے مذہب کو اپنے اجتماعی معاملات سے علاحدہ کر کے ہی دنیوی ترقی حاصل کرتے رہے ہیں۔ اس صورتِ حال کی وجہ ظاہر ہے۔ اسلام کی شریعتِ محمدی انسان کے نام خدا کا آخری پیغام ہے اور ملتِ اسلامیہ اس پیغام کی حامل ہے، جب کہ دوسرے تمام مذاہب منسوخ ہو چکے ہیں اور ان سے والبتہ افراد کو کوئی دینی ملت نہیں ہیں، لہذا اہل اسلام کا مقدر و مستقبل تو صرف اسلام پر منحصر ہے، مگر دیگر ملتیں دین سے بیگانہ ہیں اور چند روزہ دنیوی عیش کی حد تک لادینی ہی انھیں اس سستی ہے۔ یہ واقعہ نوعِ انسانی کے تمام افراد بالخصوص اہل ایمان کے لیے باعثِ امتحان ہے۔

عصر حاضر میں اسلام کو ایک بار پھر تاریخِ انسانی میں اپنا انقلابی و اصلاحی رول ادا کرنے کے لیے ایک اسلامی معاشرے کی ضرورت ہے۔ یہ معاشرہ اسلامی اصولوں کے تحت رونے ارض پر کہیں بھی برپا ہو سکتا ہے۔ ماضی میں مسلمانوں کے مراکز اقتدار جس طرح بدلتے رہے ہیں اس سے ایک سبق ملتا ہے۔ خلافتِ نبویہ کے کم زور ہونے کے بعد فاطمیوں، سلجوقیوں، عثمانیوں اور مغلوں کا عروج یہ بتاتا ہے کہ اسلام کی تقدیر

عرب و ایران کے ساتھ وابستہ نہیں، مہر و شام اور ترکی و ہندوستان کے آفاق پر بھی ہلالِ اسلام اسی طرح طلوع ہوتا رہا ہے جس طرح حجاز و عراق کے آفاق پر سب سے زیادہ سبق آموز واقعہ تو وہ ہے جس کی طرف اقبال نے اشارہ کیا ہے:

ہے عیاں یورشِ تاتار کے افسانے سے پاسباں مل گئے کعبے کو منم خانے سے

چنانچہ جنگِ عظیم اول کے زمانے میں جب عیس کا انتر کی انقلاب برپا ہوا اور مذہبی و مہاشی و سیاسی اداروں میں مہاشیوں سربراہ داروں اور ہنشاہیت پرستوں کے لات و منات توڑ دیے گئے تیر عام حریت اور انوث و مساوات کے نعرے لگائے گئے تو اقبال نے دورِ جدید میں اسلامی اقدار کی علم برداری کے لیے روس سے توقع والیت کی مگر بعد ہی وہ انتر کی دہریت، استبداد اور سامراج سے نالاں ہو گئے، چنانچہ جنگ کے بعد انھیں امریکہ آج کی دنیا کے پردے پر ایک نئی اخلاقی قوت بن کر ابھرنا نظر آیا، جیسا انھوں نے پیغامِ مشرق (۱۹۲۲ء) کے دیباچے میں اشارہ کیا ہے، لیکن وقت گزرنے کے ساتھ وہ امریکہ سے بھی بیلوں ہو گئے اور وفات سے کچھ عرصہ قبل جو انھوں نے اپنی آخری بڑی نظم اردو میں ”ایلیس کی مجلسِ شوریٰ“ کے عنوان سے لکھی اور وہ ان کے بعد از مرگ مجموعے ”ادغانِ حجاز“ میں شامل کی گئی اس کے ذریعے انھوں نے بادشاہت، جمہوریت، سربراہ داری اور اشتراکیت سبھی نظریات پر تنقید کر کے ان سے تعلق رکھنے والے معاشرہ کو رد کر دیا، جب کہ ایلیس کی زبان سے انھوں نے اس اندیشے کا اظہار کر لیا:

عصر حاضر کے تقاضاؤں سے پہلے کیوں خوف ہو نہ جائے آشکارا شرحِ پیغمبر کہیں

ٹو این بی نے (CIVILISATION ON TRIAL) میں فرار کیا ہے کہ توحید کا وہ تصور جو آج بھی انسان کی آخری امید ہے تمام خرابیوں کا باوجود ابھی تک مسلم معاشرے میں ہی جلوہ گر ہے جہاں انسان کو انسان بنانا اور نیک و نسل اور علاقہ و طبقہ کے بے جا امتیازات کم از کم اصولی طور پر نہیں پائے جلتے اور نماز، پنجگانہ سے جھجکنا یا بھر کی مساجد میں اور خانہ کعبہ کے گرد کام اہل ایمان صفت بانڈھ کر ایک دوسرے کے ساتھ کھڑے ہو جاتے اور قدم سے قدم ملا کر طواف کرتے ہیں۔ اس کے علاوہ دنیا کی رزم گاہ میں مسلم ممالک فوجی اہمیت کے اکثر مقامات پر قابض ہیں، اقوام عالم کو طائفے والی شاہراہوں کے دونوں طرف بے ہوئے ہیں اور بہترین لڑنے والی نسلیں ہنوز اسلام کے آغوش میں ہیں۔ لہذا ایک ترقی یافتہ بین الاقوامی دور کو جو عالمی معاشرہ اور عالمی حکومت مطلوب ہے اس کے بنیادی وسائل و مواقع اہل اسلام کو حاصل ہیں۔ اب ان وسائل و مواقع سے کام لے کر ایک پرامن اور عالم گیر بالبعد منتهی معاشرہ قائم کرنے اور اس تحفظ و ترقی کے لیے ایک عالمی حکومت تشکیل دینے کے لیے جس چیز کی ضرورت ہے وہ دنیا نے اسلام میں ایک مضبوط و متحرک اور موثر نظریاتی جماعت ہے، جو مسلم آبادی کے کسی بھی خطے میں ابھر کر آج کی انسانیت کی بین المللی اور بین الاقوامی تنظیم کر سکتی ہے۔ یہی تنظیم انسان کو کائنات میں ارتقاء کے حیات کی اگلی منزلوں اور آخری سرحدوں تک لے جائے گی، اسی کے ذریعے بیک وقت اور یکساں طور پر اسلام اور انسانیت دونوں کی نشاۃِ ثانیہ ہوگی، خدا کے دین کے ہر گز غلبے کا قرآنی وعدہ پورا ہو جائے گا، ہندہ خدا کے قریب پہنچ کر آخرت کا دائمی انعام حاصل کر لے گا۔